انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام

(عبد الحمید)

(۵)

اب ہم نہایت ہی اختصار کے ساتھ "دینِ اشتراکیت" کے ان چار[1] بنیادی ارکان، تاریخ کی مادی تعبیر، طبقاتی نزاع، قدر زائد، اور نظریۂ ریاست کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔

مارکس نے ایک ایسی فکری فضا میں پرورش پائی جس میں مادہ کے متعلق یہ نظریہ کارفرما تھا کہ دنیا کے یہ سارے حوادث جنہیں ہم محسوس کرتے ہیں ناقابلِ احساس ذرات کے عمل سے پیدا ہوتے ہیں شعور اور ذہن بھی مادہ ہی کے افعال ہیں۔ مادہ وجود مطلق ہے، باقی جو کچھ ہے وہ اس کا مظہر۔ مارکس نے اپنے فلسفہ کی بنیاد مادہ کے اسی تصور پر رکھی اور اس طرح اس نے تاریخِ انسانی کی ایک ایسی تعبیر کرنا چاہی جس میں مادیت کو اس کارخانۂ حیات کے سارے حادثات کا تنہا خالق قرار دیا جاسکے۔ اسی سے وجود باری تعالیٰ کی نفی کی گئی، روح کا انکار کیا گیا لیکن خوش قسمتی سے خود سائنس نے اب اس بنیاد کو یکسر باطل قرار دیا ہے۔ فطرت کا پرانا تصور نیوٹن کے نظریہ پر مبنی تھا جس کی رو سے مکان ایک خلائے مطلق ہے جس میں اشیا واقع ہیں۔ مگر اب مادہ کا سکون آفریں تصور قابلِ قبول نہیں رہا۔ فطرت اب کوئی ساکن وجود نہیں مانی جاتی جو ایک غیر متحرک خلائے مکانی میں اپنا وجود رکھتی ہو بلکہ یہ حوادث کی ایک خاص ترکیب ہے۔ یہ ایک قسم کا مسلسل تخلیقی میلان ہے جس کو ہمارا تصور الگ الگ منفرد اور غیر متحرک اشیاء میں تقسیم کر دیتا ہے جن کی بدولت زمان و مکان کے تصورات پیدا ہوتے ہیں[2]۔

مادہ کے اس جدید تصور نے مارکسی اندازِ فکر کو بیخ و بن سے اکھیڑ دیا ہے۔ مارکس کا دعویٰ یہ ہے

---

[1] ان تصورات کا تعارف اس مضمون کے تحت ترجمان القرآن جلد ۴۱ عدد ۳ میں کیا جا چکا ہے۔

[2] "اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید" از ڈاکٹر محمد اقبال؟

کہ اس کائنات میں اصل حقیقت مادہ ہے اور انسانی افکار و تصورات اُس کے پرتو۔ مگر اب خود سائنس انسان کو اس مقام پر لے آئی ہے جہاں اصل چیز ذہن قرار پاتی ہے اور عالم طبیعی اس کا عکس۔ اس لحاظ سے خارجی اشیاء بجائے خود حوادث کا سبب نہیں ہو سکتیں اور نہ ہی وہ ہمارے احساس کو جنم دے سکتی ہیں۔ ذہن کے بغیر عالم کا ربط و ضبط ناممکنات میں سے ہے۔ ہم جسے فطرت کہتے ہیں اس کے بے ترتیب اور بے ربط طومار میں اس وقت ترتیب و تنظیم پیدا ہوتی ہے جب کہ ذہن اپنے تصورات کے سانچے میں اس کو ڈھالتا ہے۔ مارکس جس انسان کا مطالعہ کرتا ہے وہ بے شعور انسان ہے جس کی حیثیت طبیعی قوانین کے ایک کھیل سے زیادہ نہیں۔ وہ اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے کہ آگہی اور وقوف کے وجود میں آنے سے ہی انسان کی آزادی کی ابتدا ہوئی اور اس دور کا خاتمہ ہوا جب وہ مجبورِ محض تھا۔ اب انسان زمان و مکان کے تقیدات کا پابند نہیں بلکہ دورِ آفاق اپنی رفتار کے پیچ و خم کو اس کے اشارۂ ابرو کے مطابق معین کرتا ہے ؎

برخیز کہ آدم را ہنگامہ نمود آمد
ایں مشتِ غبارے را انجم بسجود آمد (اقبالؒ)

اس لحاظ سے مادہ نہ تو انسانی افکار و افعال کا خالق ہے اور نہ ہی اُن کے نشوونما کا اصل محرک۔ انسان شعور کی قوت سے مسلح ہو کر مادی دنیا سے متصادم ہوا اور مزاحمت کی صلاحیتیں پیدا کر کے اُس نے اپنی ایغو (EGO) کو مستحکم کرنا سیکھا۔ یہ مادی دنیا وہ دشت ہے جس کی پیمائی سے اُس نے اپنے خلوص، عظمت اور برتری کا ثبوت پیش کیا۔ مگر یاد رہے کہ "قیس" کی یہ صحرا نوردیاں صرف بیابانوں کی خاک چھاننے کے لیے نہیں، وہ اپنی اس مجنونانہ جدوجہد میں خاک کے ذرّوں کو تلاش نہیں کرتا بلکہ اُس کی نگاہِ شوق کسی ایسے پیکرِ خیالی کو ڈھونڈتی ہے جس نے ان ذرّوں کو پامال کیا۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی افعال کا اصل محرک مادہ نہیں بلکہ اثباتِ خودی کا وہ جذبہ ہے جو انسان میں روزِ اوّل سے ودیعت کیا گیا ہے۔ یہ جذبہ ہر آن نئی خواہشات اور نئے عزائم کی تخلیق کرتا ہے اور اس طرح اپنی توسیع و بقا کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ مادی دنیا اور

اُس کے وسائل کو استعمال میں لاتا ہے۔ دنیا میں انسان نے جس قدر ترقی کی ہے وہ سب اسی ایک جذبہ کی رہینِ منت ہے۔ اسی کے ذریعہ نوعِ انسانی نے طریقِ پیدائش کی نئی نئی گرہیں کھولیں، ایجادات کی دنیا میں محیر العقول کارنامے دکھائے، زمین کے کلیجے کو چاک کر کے اس میں حیرت انگیز فراوانی کے ساتھ اناج اُگایا، اس کی گہرائیوں میں اُتر کر معادن کو تلاش کیا۔ ہوا میں اُڑنے، بجلی کو قابو میں کرنے، ہوا کے تموّج اور ذرات کو اپنے نامہ و پیام کا ایلچی بنانے اور خود بخود بجنے والے باجوں اور ہوش رُبا سرعت سے چلنے والی سواریوں کے کرشمے اسی ایک اثبات خودی کا نتیجہ ہیں۔

اگر مادّی ماحول کو ہی ان تحقیقات کی علتِ غائی قرار دیا جائے اور ہر نئی قوت کے معلوم ہو جانے کو محض ایک اتفاقی حادثہ سمجھ لیا جائے تو یہ مسئلہ خاطر خواہ حل نہیں ہوتا۔ جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ترقی اور ارتقاء کے اسباب صرف یہی دو ہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر حیوان اس سعادت سے کیوں محروم رہے۔ مادّی ماحول کی تنگ دامانی نے انہیں اس کام پر کیوں نہیں اُبھارا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان میں وہ قوتِ فکر ناپید ہے جو کسی کام کی تعمیر کے لیے ضروری ہے۔ معاملہ پھر یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مادّی ماحول کی جکڑ بندیوں میں گرفتار سارے انسانوں کو پیداواری قوتوں کی تلاش و جستجو میں یکساں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ چند خوش نصیب جن کو فطرت نے ذہانت کے خزانوں سے وافر حصہ عطا کیا ہے وہ اس میدان میں کامیاب و کامران ہوئے اور باقی ان تھک کوششوں کے باوجود نامراد رہے۔

یہ سب واقعات جو تاریخ انسانی کی بدیہی شہادتیں ہیں مادّی نظریۂ تاریخ کو کھلا چیلنج ہیں۔ مارکس کے نزدیک پیداواری قوتیں انسان کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی تصورات کو جنم دیتی ہیں مگر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان کی ذہنی استعداد، قوتِ فکر اور رجحان طبع نے پیداواری قوتوں کا کھوج لگا کر انہیں استعمال میں لانے کے لیے ابن آدم کو نئے نئے طریقوں سے آشنا کیا۔

اس کارخانۂ حیات میں انسان کے معاشی تقاضوں کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں اس امر میں جو کچھ اختلاف ہے وہ یہ کہ تہذیب و تمدن کی ہر چیز ان تقاضوں کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ اس کی تعمیر میں

دوسرے عوامل بھی اسی طرح شامل ہیں جس طرح کہ معاشی۔ انسان کو حیاتِ مستعار کی چند گھڑیاں گزارنے کے لیے کھانے کی ضرورت ہے، گرمی اور سردی سے بچنے کے لیے لباس درکار ہے، سر چھپانے کے لیے وہ مکان کا محتاج مگر اس کی یہ ضروریات اور اُن کی فراہمی کی مختلف تدابیر اُس کی ذہنی اور شعوری کیفیات کو تخلیق نہیں کرتیں۔ ایک مصور تصویر کے بنانے میں مختلف رنگوں سے کام لیتا ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ کبھی نہیں نکالا جا سکتا کہ مصور کے مختلف رنگ ہی اُس کے آرٹ کے اصلی خالق ہیں۔ پیدائشی قوتیں اور حالات پیداوار ایک دوسرے پر اسی طرح اثر انداز ہوتے ہیں جس طرح نئے اسلحہ کی ایجاد طریقِ جنگ کو متاثر کرتی ہے۔ مگر اس سے اگر کوئی سمجھ بیٹھے کہ جنگ کے شعلوں کو بھڑکانے کا سب سے بڑا محرک اسلحہ کی ترقی اور فوجی تنظیم کی وسعت ہے اور دنیا کی عسکری تاریخ کے ارتقاء کا یہی ایک سبب ہے تو اس کے قاصر العقل ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

مارکس نے اپنے فلسفۂ تاریخ میں جس بے راہ روی کا مظاہرہ کیا اُس کو بعض بڑے بڑے مخلص اشتراکیوں تک نے محسوس کیا اور اپنے پیر و مرشد کی اس "مجذوبانہ بڑ" کی کوئی معقول تعبیر پیش کرنے کی سعی کرتے رہے۔ چنانچہ پروفیسر جی۔ ڈی۔ ایچ اپنی کتاب مارکسزم کے مطالب (MEANING OF MARXISM) میں لکھتا ہے:-

"سماج کی معاشی تنظیم میں، سیاسی اداروں اور معاشرتی نظام میں ایک رابطۂ اتحاد دریافت کیا جا سکتا ہے اور یہ سمجھنا بھی کسی حد تک آسان ہے کہ کس طرح عہد ماضی میں سیاسی اور معاشرتی نظام معاشی حالات کے مطابق بدلتے رہے۔ مگر اس نظریہ کو اس حد سے زیادہ بڑھانا خطرناک ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ سماج جو پیدائش کے طریقوں کے لحاظ سے ایک ہی سطح پر ہوں ان کی معاشی تنظیم، خاندانی نظام، گروہی تعلقات، سیاسی اور مذہبی اداروں یا اخلاقی تصورات بھی ایک سے ہوں۔ علم انسانیات کی جدید تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس دنیا میں بعض ایسے تمدن معرضِ وجود میں آئے جن کی کوئی معاشی وجہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ اگر ان میں کوئی باہمی مناسبت موجود ہے تو وہ صرف اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ

سماجی اداروں پر معاشی حالات اثر انداز ہوتے رہے۔ سماج کی معاشی بنیاد کو اگر سب سے زیادہ اہم بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ بے شمار عوامل میں سے صرف ایک عمل ہے۔"

تاریخ انسانی میں ایسے بیشمار واقعات ملتے ہیں جو اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ قوموں کی تعمیر میں معاشی محرکات سے کہیں زیادہ اہم غیر معاشی محرکات ثابت ہوئے۔ مثال کے طور پر ہم صرف ایک واقعہ پیش کرتے ہیں۔ مارکس نے تاریخ انسانی کو جن مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے اس کے مطابق رومی اور قرنِ اوّل کے مسلمان معیشت کے ایک ہی دور میں تھے۔ یعنی دونوں اقوام میں غلامی کا رواج تھا، پیدائش دولت کے طریق بھی دونوں کے ہاں ایک جیسے تھے۔ مارکس کے نظریہ کے مطابق ان دونوں قوموں کو اخلاق کی ایک ہی سطح پر ہونا چاہیے تھا۔ لیکن تاریخی شہادتیں اس کے خلاف ہیں۔ تاریخ کا ایک مبتدی بھی اس عظیم فرق سے بخوبی واقف ہے جو ان دونوں قوموں کے اخلاقی تصورات کے درمیان پایا جاتا ہے۔ رومیوں کا اپنے غلاموں سے سلوک اس قدر سخت اور وحشتناک تھا کہ اس کے تصور سے آج بھی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام نے اس مظلوم طبقے کو ظلم و استبداد سے نجات دلائی، اسے حیوانیت کی سطح سے اٹھا کر انسانیت کے معراج پر پہنچایا۔ یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ ایک قسم کے ملکیتی تعلقات کے اندر رہتے ہوئے بھی دونوں قوموں کے اخلاقی نظریے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ قوموں اور افراد کی زندگی کی تعمیر میں فیصلہ کن قوت معاشی نہیں بلکہ وہ مقاصد ہیں جن کی سعی و طلب کے لیے وہ زندہ ہیں۔ انہی کی قوت سے وہ ہر قسم کے موانع پر چاہے وہ معاشی ہوں یا عمرانی، فتح حاصل کرتے ہیں۔ مقاصد کی لگن جس قدر گہری اور شدید ہو گی اسی نسبت سے انسان اپنے اندر تسخیر فطرت کی صلاحیت پیدا کر سکیں گے اور وہ مادی ماحول کو اپنی ضروریات کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب ہوں گے۔ اس لیے کسی قوم یا فرد کی سیرت کی تعمیر میں اصل قوت وہ آئیڈیل ہے جس کے لیے کوئی قوم یا انسان زندہ ہے۔ اسی موضوع پر کارل فیڈرن (KARLFEDERN) بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کسی قوم کی آئیڈیالوجی (IDEOLOGY) صرف اس کے

معاشی ماحول کی پیداوار ہے تو اس سے یہ نتیجہ از خود برآمد ہوتا ہے کہ وہ سارے انسان جو ایک ہی قسم کے معاشی ماحول میں رہتے ہیں اُن کے خیالات و افکار ایک ہی قسم کے ہونے چاہئیں۔ مگر عملی زندگی میں ہم حالات اس سے بالکل مختلف پاتے ہیں — نہ صرف ایک جیسے معاشی حالات میں زندگی بسر کرتے ہوئے بلکہ ایک ہی خاندان کے اندر رہتے ہوئے بھی لوگوں نے زندگی کی مختلف راہیں اختیار کیں۔

آیئے اب اسی مسئلہ پر ایک دوسرے زاویہ سے نگاہ ڈالیں

مارکس کے اس نظریہ میں جو قصرِ اشتراکیت کا سنگِ بنیاد ہے سب سے زیادہ تناقض دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف تو وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ انسان کے اندرونی محرکات سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ سراسر مادی اور خارجی ماحول کا نتیجہ ہیں، مگر دوسری طرف وہ مٹی کی ان بے بس مشینوں" کے افکار و اقدار پر نیک و بد، محمود و مذموم کا فتویٰ بھی صادر کرتا ہے۔ جب انسان خارج کا بے بس آلۂ کار ٹھیرا جس کی حیثیت اس کارگہِ حیات میں ایک بے بس کھلونے سے کچھ زیادہ نہیں تو پھر انسانی آزادی اور اخلاقیات کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ مگر مارکس جیسا فلسفی، ان دو "اَن میل" تصورات کو جوڑنے کی سعی کرتا ہے۔ وہ اپنے دعویٰ کو تو پوری شدت کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ انسان خارجی احوال اور گرد و پیش کے اثرات کا مجبور بندہ ہے اور اس کی ذہنیت و سیرت بالکلیہ خارجی اثرات سے تشکیل پاتی ہے مگر جب اس دعویٰ کے منطقی نتائج کو وہ دیکھتا ہے کہ اس سے ہر قسم کے افعال کو جائز اور برحق ماننا پڑے گا تو فوراً ان کا انکار کرتا ہے۔ جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہر چیز خارجی حالات سے میکانکی طور پر پیدا ہوتی ہے اور ہمارے ارادہ و اختیار کے بغیر ہم سے سرزد ہوتی ہے یا ہم پر مسلط رہتی ہے۔ تو اس لحاظ سے وہ بُری یا اچھی کیسے کہلائی جا سکتی ہے لہٰذا مذہب اور اُس کے معتقدات ماننے پر ہم مجبور ہیں کیونکہ وہ بھی ہمارے خارج اور ہمارے گرد و پیش سے وجود میں آتے ہیں۔ اُن کا وجود ہی اُن کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جو کچھ کہ دنیا میں ہو رہا ہے یا کیا جا رہا ہے سب کو مبنی بر انصاف ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ سرمایہ دار اپنی

معاشی لوٹ کھسوٹ میں، سامراج کے نمائندے اپنے سیاسی ظلم و ستم میں اور فاسطی آمرا اپنے جابرانہ افعال میں اسی طرح مجبور ہیں جس طرح اشتراکی حضرات اپنی انقلاب انگیزی میں۔ انسان کے کسی فعل اور اُس کی کسی تدبیر کو باطل قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ دنیا آزاد، ذمہ دار اور اخلاقی انسانوں کی دنیا نہیں بلکہ وہ ایسی کٹھ پتلیوں کی تماشا گاہ ہے جن کی ڈور کو مادی ماحول کا پیتناک ہاتھ ہلا رہا ہے۔ کیا اشتراکیت کے حامی، جن کے حلق اپنے مخالفین کو کوستے کوستے سوکھ رہے ہیں۔ اپنے "شیخ طریقت" کے فرمان کے اس طبعی نتیجہ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں۔

(۲) مارکس کا دوسرا نظریہ بھی انسانی فطرت کے متعلق نہایت ہی گھناؤنے تصور پر مبنی ہے۔ اُس کے نزدیک انسان میں کبھی بھی نیکی، صداقت، انصاف پسندی جیسی صفات عالیہ پرورش نہیں پا سکیں۔ وہ کبھی بھی از خود اپنے حقوق سے زائد سے دست بردار ہونے پر رضامند نہیں ہوا۔ اُس کے دل میں کبھی یہ جذبہ موجزن نہیں ہوا کہ وہ صلح، آشتی اور اپنی ضمیر کی پکار پر دوسروں کے جائز حقوق اُن کو لوٹا دے۔ مادی زندگی اور اُس کی لذتوں سے بڑھ کر اُسے آج تک کسی چیز کا خیال نہیں آیا اُسے جب بھی خیال آیا تو یہی کہ وہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالے، اُس نے جب کبھی سوچا تو وہ یہی تھا کہ وہ اس دنیا کے ساز و سامان کو زیادہ سے زیادہ سمیٹے۔ وہ ہمیشہ سے منافق، دھوکہ باز، چالاک اور عیار رہا ہے۔ وہ مذہب، اخلاق، خدا ترسی، حق و صداقت کے نام پر کمزوروں کو لوٹتا رہا اور اپنے افعال کو پسندیدہ دکھانے کے لیے یہ نام استعمال کرتا رہا۔ انسان نے آج تک جتنے معاشرے قائم کیے ہیں۔ اُن سب کی تاریخ طبقاتی نزاع کی تاریخ ہے۔ مختلف انسان ہر دور میں اور ہر ملک میں صرف ڈیوں کی تقسیم پر باہم برسرِ پیکار رہے ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بسا اوقات مظلوم طبقے اپنے جائز حقوق کے حصول کے لیے ظالموں کے مقابلے میں صف آرا ہوئے مگر یہ کہنا تو یقیناً غلط ہے کہ ساری تاریخ محض اس نزاع و کشمکش کی داستان ہے یا یہ کہ انسانی معاشرے کی تمام تبدیلیوں کا واحد سبب صرف یہی طبقاتی تقسیم ہے۔ تاریخ کے اوراق سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ قومی لڑائیوں کے اثرات طبقہ واری لڑائیوں سے کسی طرح کم نہ تھے بلکہ یہ کہنا بھی

حقیقت سے دُور نہ ہوگا کہ قومی لڑائیاں طبقہ واری لڑائیوں سے زیادہ کثیر الوقوع، زیادہ تند و تیز، زیادہ خونریز اور انسانی مستقبل کے لیے زیادہ فیصلہ کن تھیں۔ آپ تاریخ انسانی پر جس قدر گہری نگاہ ڈالیے اسی قدر اس حقیقت کو تسلیم کریں گے کہ انسان زیادہ تر قوموں، نسلوں کے پرچم تلے لڑتے رہے۔ خود ہمارے زمانہ میں، جب کہ دنیا کے سارے انسان مارکسیوں کے بقول دو طبقوں میں بٹ گئے ہیں جتنی لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں قومی احساس اور ہم وطنی کے جذبات طبقاتی شعور سے زیادہ موثر اور طاقتور ثابت ہوئے۔ کیا جرمنی کے مزدور روس کے مزدوروں سے برسرِ پیکار نہیں ہوئے۔ کیا انگلستان کے غریب طبقوں نے اس جنگ میں غیر ملکی پرولتاریہ برادری کے مقابلہ میں اپنے ہی وطن کے ظالم بورژوا کے دوش بدوش کھڑے ہو کر اپنی قوم کی حفاظت نہیں کی۔ کیا ہندوستان کی تقسیم طبقاتی کشمکش کا نتیجہ تھی یا اس کے اسباب کچھ اور تھے۔ یہ سب واقعات اپنی جگہ پر اس قدر ٹھوس حقائق ہیں کہ انہیں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ انسان کے اندر اثبات خودی کا جذبہ موجود ہے۔ وہ جب کبھی اپنی خواہشات یا اپنے عقائد و مسلمات کی راہ میں کوئی سنگ گراں پاتا ہے، خود آمادۂ پیکار ہو جاتا ہے۔ محض معاشی ضروریات اور مادی تقاضے یا طبقاتی کشمکش سے تاریخ کی لڑائیوں کی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔

پھر جس اصول کی بنا پر مارکس انسانیت کو دو طبقوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اُس اصول کو ہی اس دور نے بالکل غلط ثابت کر دیا ہے۔ مارکس کا خیال ہے کہ وہ لوگ جو پیداواری قوتوں پر قابض ہوتے ہیں وہ ایک طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو ان ذرائع سے کام لے کر "قدرِ زائد" پیدا کر کے اپنے آقاؤں کے لیے سامانِ راحت فراہم کرتے ہیں۔ اُن کا رشتۂ اتحاد مظلوم پرولتاریہ سے ہوتا ہے۔ پھر یہ پرولتاریہ اور بورژوا اپنے اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے دوسرے سے جنگ آزما ہوتے ہیں۔ مارکس نے جن حالات میں اپنا یہ نظریہ تصنیف کیا اُس وقت صرف یہی دو گروہ تھے مگر رفتارِ زمانہ نے ایک تیسرے گروہ کو جنم دیا ہے جنہیں نہ تو بورژوا میں شامل کیا جا سکتا ہے اور نہ پرولتاریہ میں۔ یہ طبقہ اُن مزدوروں پر مشتمل ہے جنہیں کارخانوں کے نظم و نسق میں اور اُن کے منافع میں شریک کیا جاتا ہے۔ ان کی ایک حیثیت مظلوم محنت کشوں کی سی ہے اور دوسری حیثیت سے وہ ظالم اور جابر بورژوا سے تعلق رکھتے ہیں۔

مزدوروں کی یہ نئی جماعت بڑی تیزی کے ساتھ دنیا کے معاشی نظام میں اہمیت حاصل کر رہی ہے اور حالات کے تیور بتا رہے ہیں کہ مستقبل کی تعمیر میں اس طبقہ کو ایک نہایت ہی اہم پارٹ ادا کرنا ہے۔ مارکس نے اپنے نظامِ فکر میں اس گروہ کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

مزدوروں کے اس نئے طبقے نے مارکس کے نظریہ ارتکازِ مال (CONCENTRATION OF CAPITAL) کو بھی یکسر غلط ثابت کیا ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ سرمایہ اور محنت کی تفریق بڑھنے سے سرمایہ کی مقدار میں تو یقیناً اضافہ ہوگا مگر اُس کی ملکیت محدود ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ بالآخر قوم کا سرمایہ صرف چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے گا اور اس طرح متوسط طبقہ میں جو تھوڑی بہت خوشحالی نظر آ رہی ہے اُس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

مگر آپ صنعتی ممالک کی پچھلی تیس سالہ تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کیا واقعی یہی کچھ ہوا ہے جس کی مارکس نے پیش گوئی کی تھی۔ کیا دنیا کے مزدور پہلے سے غریب تر ہو رہے ہیں یا اُن کا معیارِ زندگی بڑھ رہا ہے؟ کیا متوسط طبقہ بالکل ختم ہو رہا ہے یا وہ آہستہ آہستہ دنیا کے نظامہائے معیشت میں اہمیت حاصل کر رہا ہے۔ یہ تیسری کلاس جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس نے اس مفکر کے سارے خیالات کو ایک خوابِ پریشاں ثابت کیا ہے۔

"طبقاتی تقسیم" جس پر وہ اپنے اس نظریہ کی بنیاد رکھتا ہے نہایت ہی مبہم اور غیر واضح اصطلاح ہے۔ وہ اپنی قابلیت اور ذہانت کے باوجود "طبقے" کی کوئی جامع اور مانع تعریف پیش نہ کر سکا۔ اُس نے اس مسئلہ کو اپنی کتاب "سرمایہ" کی تیسری جلد میں چھیڑا مگر اس کا کوئی معقول حل نہ پا کر اُسے بالکل ادھورا رہنے دیا۔ انسانی سماج اس قدر پیچیدہ عناصر سے مرکب ہے کہ علم کیمیا کی طرح انہیں سادہ اجزا میں الگ نہیں کیا جا سکتا، ایک خاص گروہ پر بڑی "سادہ دلی" سے "پرولتاریہ" یا "بورژوا" کا ٹھپہ نہیں لگایا جا سکتا۔ مارکس کے اپنے کلیہ کے مطابق سماج کو لاتعداد طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے چند ایک کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور بعض کے ہم آہنگ ہیں۔ یہ گروہ بندی بالکل اضافی ہے۔ ہم اپنی اس پُراسرار زندگی میں کسی نقطہ پر پہنچ کر یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے کہ یہ ہے اصل مقام

جہاں ایک طبقہ کی حدود ختم ہوتی ہیں اور دوسرے کی سرحد کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ حالاتِ زمان و مکان کے فرق سے یہ حد بندیاں بھی بدل جاتی ہیں۔ تاریخ انسانی اس حقیقت پر گواہ ہے کہ بسا اوقات تاریخ کی ایک معمولی کروٹ نے، چاہے وہ ذرائع پیداوار کے اعتبار سے کس قدر غیر اہم اور غیر موثر تھی، طبقاتی تقسیم کے اس سارے نقشہ کو الٹ کر رکھ دیا۔

(ج) مارکسیت کا تیسرا اصول کہ "کسی شے کی اصل قدر محنت کی وہ مقدار ہے جو اسے پیدا کرنے میں صرف ہوتی ہے" بھی بالکل غلط ہے۔ محنت کسی چیز کی پیدائش میں ایک اہم جزو کی حیثیت سے تو ضرور شامل ہوتی ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بلا شرکت غیرے اسی کی کرشمہ سازی ہے تو یہ مبالغہ آمیزی ہوگی۔ مارکس کے پیش کردہ اصول کے مطابق مختلف اشیاء کی قیمتوں میں تفاوت کی اصل وجہ اُن کی پیداوار میں محنت کی کمی بیشی ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات ایک شے کی پیدائش میں بہت کم محنت صرف ہوتی ہے مگر اس کے مقابلہ میں اُس کی قیمت زیادہ وصول ہوتی ہے۔ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض اشیاء بڑی محنت کے صرف کے بعد پیدا کی جاتی ہیں، مگر زمانہ کی ایک گردش اُن کی قدر کم کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کی قدر کا انحصار صرف محنت پر ہی نہیں بلکہ طلب کی کشش پر بھی ہے، مارکس اسے یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔

اسی طرح اُس کا نظریہ "قدرِ زائد" بھی بالکل ڈھکوسلہ ثابت ہوا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قدرِ زائد حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ "غریب مزدور" کی محنت سے ناجائز انتفاع ہے تو پھر سرمایہ داروں کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ مشینری کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ مزدور بھرتی کریں۔ کیونکہ ان کی محنت سے انہیں زیادہ منافع کی امید ہے۔ آپ خود غور کریں کہ کیا دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ کیا سرمایہ دار اپنے منافع کے حصول کے لیے انسانوں کو کارخانوں سے نکال نکال کر وہاں مشینوں سے کام نہیں لے رہا۔

(د) سب سے آخر میں مارکس کے نظریۂ ریاست پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ اس میں اس مفکر نے اپنے نظریہ کو برحق ثابت کرنے کے لیے کن کن حقائق سے چشم پوشی کی ہے۔ مارکس کے نزدیک ریاست

جبر و استبداد کا ایک ایسا طاقتور ادارہ ہے جس کی مدد سے سرمایہ دار غریب، بے کس اور مفلوک الحال پرولتاریہ کو لوٹتے ہیں۔ اس ادارہ کا مقصد کمزوروں کے حقوق کی پاسبانی کرنا نہیں بلکہ اس کی غرض و غایت صرف حکمران طبقہ کے ناجائز مفادات کی حفاظت اور نگرانی کرنا ہے۔ اس کے اندر رہتے ہوئے اگر کوئی فرد یا گروہ عدل و انصاف کی توقع کرتا ہے تو وہ جنت الحمقا میں بستا ہے، کیونکہ اس کے قوانین کی تدوین اس طرز پر سے کی جاتی ہے جس سے "بے بسوں" کو امراء کے پنجۂ استبداد میں جکڑا جا سکے اور وہ ان سے جس طرح چاہیں اپنی "بہتری" کے لیے کام لے سکیں۔ اب اگر انسانیت ظلم سے نجات چاہتی ہے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ اقتدار کو سرمایہ داروں سے چھین کر محنت کشوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ یہ "پاکباز" اور "بے غرض" لوگ اقتدار کے تخت پر متمکن ہوتے ہی انفرادی ملکیت کا خاتمہ کر کے طبقاتی تقسیم کو یکسر مٹا دینگے اور اس طرح فساد کی وہ اصل جڑ کٹ جائے گی جس سے ریاست کا یہ شجرِ خبیث اپنی خوراک حاصل کرتا ہے۔ کچھ دیر زندہ رہنے کے بعد یہ درخت خود بخود سوکھ کر پیوند خاک ہو جائیگا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے سائے میں رہنے والے بوزروا اس کا "سایۂ عاطفت" اٹھ جانے کے بعد موت کا جام پی لینے پر خود بخود مجبور ہو جائیں گے۔ یہ ہے وہ راستہ جس پر گامزن ہو کر مسکین پرولتاریہ "ان" بھیڑیوں" سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ تجویز بظاہر بڑی جاذب نظر ہے۔ ہمارا ہر روز کا مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ جب کبھی ایک سماج کے مختلف طبقوں میں کوئی کشمکش نمودار ہوئی تو ریاست کی مشینری، اس کی بندوقوں اور توپوں نے غریبوں کو نہایت بیدردی سے کچل کر رکھ دیا اور ہمیشہ حکمران طبقوں کی حفاظت کی۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ ادارہ ہمیشہ سے ظالموں کا پشت پناہ رہا ہے اور اس کے ذریعہ کبھی سماج میں عدل و انصاف قائم نہیں ہوا۔ اسی تاریخ میں ہمیں کئی ایسے روشن ادوار ملتے ہیں جن میں اس ریاست نے امراء کا آلۂ کار بننے کی بجائے غریبوں اور کمزوروں کے حقوق کی نگہداشت کی۔ قریش اسی لیے آخری دم تک مسلمانوں سے برسرِ پیکار رہے کہ اسلامی ریاست اس معاشرتی اور سیاسی تفوق کو مٹا رہی تھی جو ان لوگوں کو اسلام کے آنے سے پہلے معاشرے میں حاصل تھا۔ اسلامی ریاست کا وجود برسرِ اقتدار

لوگوں کے مفادات کی حفاظت کے لیے نہ تھا بلکہ اس کی غایت سماج کے مختلف طبقوں میں مساوات کو قائم کرنا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اپنی حکومت کا بنیادی مقصد بتاتے ہوئے فرماتے ہیں :

والضعیف فیکم قوی عندی حتی ارجع علیه حقه ان شاء الله والقوی فیکم ضعیف عندی حتی اخذ الحق منه ان شاء الله

اور تم میں جو بے اثر ہیں۔ میرے نزدیک وہ با اثر ہیں یہاں تک کہ میں ان کا حق واپس دلا دوں (انشاء اللہ) اور تم میں جو با اثر ہیں وہ میرے نزدیک بے اثر ہیں۔ یہاں تک کہ میں ان سے دوسروں کا حق وصول کر لوں (انشاء اللہ)

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے :۔

واللہ ما منکم اقوی عندی من الضعیف حتی اخذ له الحق ولا اضعف عندی من القوی حتی اخذ الحق منه

خدا کی قسم تم میں سے کمزور میرے نزدیک سب سے زیادہ طاقتور ہے جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں۔ اور تم میں سے طاقتور میرے لیے ضعیف تر ہے جب تک اس سے میں حق وصول نہ کر لوں۔

اس ضمن میں یہ بھی یاد رہے کہ یہ اصول صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں تھے بلکہ ان کا اطلاق ہر اس فرد پر ہوتا ہو اسلامی ریاست کے اندر رہتا تھا۔

ان اقوال کا بار بار مطالعہ کیجئے اور پھر دیکھیے کہ کیا ریاست کا مقصد ظالموں اور جفا کاروں کے حقوق کی نگہبانی کرنا تھا یا اس کا نصب العین ان طبقوں کی طاقت کو کمزور کر کے بے سہارا افراد کو ان کے چنگل سے آزاد کرنا تھا۔ یہ دو اقوال میں نے بطور مثال پیش کیے ہیں۔ اگر آپ تاریخ کی ورق گردانی کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کس محنت و جانفشانی سے ان بزرگوں نے سماج میں ناجائز انتفاع کو روکا اور ہر مستحق کو اس کا حق دلوا کر چھین لیا۔ تاریخ کے صفحات میں جب تک اس دور کے نشانات باقی ہیں اس وقت تک مارکس کے نظریۂ ریاست کی صداقت مشکوک رہے گی۔

اس نظریہ کی صحت کا ایک اور بنا پر بھی اقرار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم چند لمحوں کے لیے یہ تسلیم کرتے

ہیں کہ پرولتاریہ ذاتی ملکیت کو بالکلیہ ختم کر کے اپنی ایک ریاست کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس کے انتظام و انصرام میں کوئی بورژوا شریک نہیں کیا جاتا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مزدور طبقہ جو اب حکمران بھی ہے، کن اخلاقی صفات سے متصف ہو کر سلطنت کا نظم چلائے گا۔ ظاہر بات ہے کہ اس کے سامنے صرف ایک مقصد ہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مادی آسائش حاصل کی جائے۔ کیونکہ اشتراکی تحریک ابتدا ہی سے انسان کے انہی جذبات کو ابھارتی ہے اور دوسرے تمام تصورات و محرکات کو یہ کہہ کر مٹاتی ہے کہ یہ سب بورژوا کے خود ساختہ تصورات ہیں جو اس کے طبقاتی مفاد کی حفاظت کے لیے گھڑے گئے ہیں۔ اس بنا پر کیا یہ ناممکن ہے کہ پرولتاریہ کے یہ حکمران افراد عام لوگوں سے کہیں زیادہ معاشی اغراض کے بندے اور مادی خوشحالی کے پرستار ہوں اور اس لحاظ سے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سامان عیش سمیٹنے کی فکر کریں۔ البتہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس حکومت میں فائدہ اٹھانے والے اور استحصال (EXPLOTAION) کرنے والے افراد خود "مظلوم پرولتاریہ" کے ایک خاص طبقہ پر مشتمل ہونگے اور اپنے ہی بھائی بندوں کو اپنی اغراض کا آلۂ کار بنائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہماری مادی خواہشات پر اخلاق کی گرفت مضبوط نہیں ہوتی اس وقت تک زندگی میں لوٹ کھسوٹ ختم نہیں کی جا سکتی۔ زمام کار خواہ "پرویز" کے ہاتھ میں ہو یا "کوکین" کے ہاتھ میں، اگر وہ اخلاق سے عاری ہیں تو دونوں سے ایک جیسے اعمال سرزد ہونگے ؎

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اس سلسلہ میں یہ بھی ذہن نشین رہے کہ انسان کے سینے میں پلنے والے جذبات میں ایک زبردست جذبہ "نمائش" بھی ہے۔ انسان اپنے ابنائے جنس میں اپنی فوقیت اور برتری کے اظہار کا خواہشمند ہوتا ہے اور اسی کے لیے وہ دولت، ثروت اور اقتدار کو حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس جذبہ کی سب سے بہتر طور پر تسکین اقتدار کے نشہ سے ہوتی ہے۔ دور جدید میں افراد اور مختلف گروہ اگر دولت اور ذرائع پیداوار پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے زیادہ فکرمند نظر آتے ہیں،

تو اُس کی وجہ صرف یہی ہے کہ سرمایہ اقتدار کے حصول کا سب سے موثر ذریعہ ہے - یہ مقصد اگر کسی اور طریق سے حاصل ہو سکتا تو انسان اُسی کو اختیار کر لیتا - ان حالات میں جب کہ اشتراکی حضرات مادی زندگی اور اس کے فوائد و لذائذ سے بلند تر کسی چیز کا تصور تک نہیں کر سکتے، یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ از خود تخت و تاج سے دست بردار ہو جائیں گے -

مارکس کا خیال تھا کہ ریاست آہستہ آہستہ مٹ جائے گی مگر حالات کی رفتار صاف بتا رہی ہے کہ یہ ادارہ مزدوروں کے اپنے ہاتھوں سے مستقبل میں آج کی نسبت زیادہ مستحکم اور مضبوط صورت اختیار کرے گا - سٹالن کے ہاتھوں ٹراٹسکی کی بربادی اور مالنکوف کے ہاتھوں بیریا کا قتل اسی ہوسِ اقتدار کا نتیجہ ہے - روس کی چند سالہ تاریخ اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ سٹیٹ کا دائرۂ اختیار روز بروز بڑھ رہا ہے اور اسی طرح حکمران طبقہ کو غربا کے لوٹنے کے لیے زیادہ سے زیادہ قوت فراہم ہو رہی ہے -

(باقی آئندہ)